رسائل و مسائل

کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟

ایک صاحب نے ماہ شوال ۶۲ھ کے ترجمان القرآن میں "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" کے زیر عنوان "ایمان" کی بحث پڑھ کر ایک شبہ پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

اسلام کا مقصود بالذات توحید و عبادت الٰہی ہے۔ انبیا محض ذریعہ ہیں اور ان پر ایمان مقصود اصلی نہیں ہے۔ ہر شخص ایمان کے لئے اپنی وسعت علم اور فکر تک مکلف ہے لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم توحید پر ایمان رکھے اور اپنے طریق پر عبادت الٰہی کرے مگر اپنے علم اور فکر سے کام لینے کے باوجود رسالت کے متعلق نیک نیتی سے شکوک رکھتا ہو ایسے شخص کو ناجی قرار نہ دینے کی معقول وجہ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ذیل کی آیات توجہ کے قابل ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ (۳:۶۴)۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ۔۔۔۔ لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ (۳:۱۲)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (۵۷:۲۸)۔

آیت موخر الذکر کے متعلق یہ بھی بتائیے کہ "کفلین" سے کیا مراد ہے اور کفل تثنیہ کیوں ہے؟

اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعتوں میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ اگر اس کو بنظر غائر ملاحظہ کیا جاتا تو غالباً یہ شبہ آپ سے آپ رفع ہوجاتا تاہم یہاں پھر ایک مرتبہ اس مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے امید ہے کہ اس کے بعد کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔

آپ نے اپنے پہلے فقرے میں اسلام کا جو مقصد بیان فرمایا ہے وہ دراصل اسلام کے مقصد کا پورا بیان نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے لیکن میں بخوف طوالت اس بحث میں نہ پڑونگا۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا جو ادھورا مقصد آپ نے متعین کیا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے بھی انبیا علیہم السلام کی رہنمائی ناگذیر ہے۔

سب سے پہلا سوال جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ اسلام کا جو مقصد آپ قرار دیتے ہیں اس کے حصول کا یقینی ذریعہ کیا ہے؟ "توحید" جس چیز کا نام ہے وہ صرف "خدا کو ایک کہنا" ہی نہیں ہے بلکہ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا صحیح علم ہے اسی طرح "عبادت الٰہی" کا مفہوم بھی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی پرستش کی جائے، بلکہ صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت یہ ہے کہ انسان شرک کے تمام شائبوں سے بچ کر اپنی بندگی کو اس ذات پاک کے لئے خالص کردے۔ یہ دونوں چیزیں (یعنی علم ومعرفت کی صحت، اور عبادت کا خلوص) اسلام کی اصطلاح میں "ہدایت" کے جامع نام سے موسوم ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے کہ ہدایت جس شے کا نام ہے وہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہو۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳:۸) اور خدا کی طرف سے ہدایت پانے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو کسی کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے ہدایت آئے۔ یا کسی ہدایت یافتہ آدمی کا اتباع کیا جائے۔ پہلا شخص اسلام کی اصطلاح میں رسول یا نبی ہے۔ اور دوسرے شخص کے لئے اصطلاحی نام "مومن" اور "مسلم" ہے

پس اگر کوئی شخص توحید کا صحیح علم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی عبادت خالص ہو چکی ہے، تو لامحالہ یا تو وہ خود نبی ہے یا کسی نبی کا متبع لیکن اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو اس کے پاس علم نہیں ہے محض "ظن" اور "خرص" ہے وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳: ۲۸) اور جب اس کے پاس علم نہیں ہے تو اس کی عبادت بھی خالص نہیں ہو سکتی، کیونکہ عبادت کا خلوص دراصل علم و معرفت کی صحت ہی پر مترتب ہوتا ہے۔

آپ کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ قرآن کے اس دعوی پر عقلی دلیل پیش کی جائے۔ میں اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لئے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰: ۳۰)۔ اور حدیث نبوی میں آیا ہے کہ كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لئے چند شرائط ہیں، اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں۔

پہلی شرط قوت مشاہدہ کی تیزی ہے، تاکہ انسان آنکھیں کھول کر آفاق اور انفس میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھے اور صفات الٰہی کے ان نشانات کو پہچانے جو کائنات کے ہر ذرے اور خود انسان کے اپنے وجود میں پائے جاتے ہیں لیکن نوع انسانی کی ایک بڑی اکثریت اس قوت مشاہدہ سے محروم ہے وہ آثار و مظاہر کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے باطن کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ قرآن اس کی شکایت کرتا ہے کہ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (۱۲: ۱۰۵) "آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ گزر جاتے ہیں اور التفات ہی نہیں کرتے۔" وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ (۱۰: ۹۲) "لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں

سے غافل ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سرے سے مشاہدہ کی قوت ہی نہیں رکھتے ان کے لئے معرفت کا دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان میں غور و فکر کا مادہ موجود ہو، اور وہ بھی صحیح و سلیم ہو، تاکہ انسان اپنے مشاہدات کو صحیح طریقے سے ترتیب دے کر ان سے صحیح نتائج اخذ کرسکے یہ شرط پہلی شرط سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔ اول تو غور و فکر کرنے والے افراد ہی نوع انسانی میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں اُن میں بھی صحیح الفکر افراد کم پائے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ اور وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ غور و فکر کا فقدان، اور صحت فکر کی کم یابی اُن موانع میں سے ہے جو انسان کو علم حق تک پہنچنے سے روکتے اور اسے ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ راہ راست کے نشانات ہر طرف موجود ہیں، مگر جو شخص ان نشانات کو سمجھتا ہی نہ ہو وہ کیونکر صحیح راستہ کو پاسکتا ہے یہی بات قرآن مجید میں کہی گئی ہے کہ ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں مگر ان کے لئے جو عقل رکھتے ہوں وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴:۳۰)۔ اور دیکھئے کہ یہی بات دوسرے موقع پر کتنے زور کے ساتھ کہی گئی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۲۲:۷)

ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے جن کا حال یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے کچھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ، یہ وہی لوگ ہیں جو غفلت برتنے والے ہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ انسان کی فطرت اتنی سلیم ہو کہ وہ سوسائٹی کے اثرات، باپ دادا کی تربیت

اور خاندانی و قومی روایات سے متاثر نہ ہو اور ان تمام پردوں کو چاک کر کے نور حقیقت کو صاف صاف دیکھ سکے۔ یہ شرط پہلی دونوں شرطوں سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔ بڑے بڑے ذی علم، عاقل اور ذکی و فطین لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سوسائٹی اور خاندان کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جس ڈگر پر ماحول نے ان کو ڈال دیا ہے اسی پر چلے جا رہے ہیں، اور اسی کو حق سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس کو بھی گمراہی کا اہم سبب بتاتا ہے۔ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵: ۱۴)۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ انسان میں حق پسندی اور اس کے ساتھ قوت ارادی اتنی زبردست ہو کہ وہ خود اپنے نفس کی خواہشات اور رجحانات کا مقابلہ کر سکے، کیونکہ ہوائے نفس اول تو معرفت حق ہی میں مانع ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص حق کو پہچان بھی لے تو وہ اس کو قلب و روح میں جاگزیں کرنے اور بندگی و عبادت کو خدا کے لیے خاص کر دینے میں قدم قدم پر مزاحمت کرتی ہے۔ چونکہ انسان کے نفس میں یہ ایسی زبردست قوت ہے جو اکثر اس کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے، اور بسا اوقات اس کو جانتے بوجھتے غلط راستوں پر بھٹکا دیتی ہے اس لئے معمولی آدمی تو درکنار، بڑے بڑے لوگ بھی جو اپنے علم و فضل اور اپنی عقل و بصیرت اور فہم و فراست کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہوتے ہیں، اس رہزن کی شرارتوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی گمراہی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا ہے وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (۲۸: ۵) اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا جس نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی"۔ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (۴۵: ۳) "تو کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشات نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا باوجودیکہ وہ علم رکھتا تھا مگر (جب اس نے ایسا کیا تو) اللہ نے اسے بھٹکا دیا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی

رہزنی کے خطرے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲ : ۳۸) "ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔"

آخری شرط یہ ہے کہ انسان کی وجدانی قوتیں بیدار ہوں اس کے ذہن کا سانچہ ایسا ہو کہ صحیح اور حق بات سوچنے اور سمجھنے کے لئے غور و فکر اور استدلال عقلی کا زیادہ محتاج نہ ہو، بلکہ فطرۃً وہ غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہو اور قیاس و استدلال کے بغیر محض حدس (Intuition) کی قوت سچی اور حق بات تک پہنچ جائے۔ یہ شرط سب سے زیادہ کڑی مگر معرفت کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے انسان کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی وسیع ہو، غور و فکر اور تعقل و تدبر کی قوت سے وہ کتنا ہی بہرہ مند ہو، اور تقلید غیر و بندگی نفس کی زنجیروں سے کیسا ہی آزاد ہو لیکن جو حقیقتیں اس کے حواس سے ماوراء ہیں، اور جن کی پوری کنہ پر اس کی عقل اپنی طبیعت کے لحاظ سے حاوی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، ان کا علم اور علم یقین اس کو محض آثار کے مشاہدے اور محض آزاد تفکر کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ان حقیقتوں کے قریب تک پہنچ سکتا ہے، مگر ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ عقل کے زور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید ایسا ہو، اغلب ہے کہ ایسا ہو، یا حد سے حد یہ کہ ایسا ہونا چاہئے، لیکن محض تعقل اس کو اتنی قوت بہم نہیں پہنچا سکتا کہ وہ جزم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ فی الواقع ایسا ہے اور یہی حقیقت اور صداقت ہے، اور اس کے سوا جو کچھ ہے قطعاً باطل اور غلط ہے یہ جزم اور یقین اور ایمان کامل کی کیفیت صرف "حدس" سے پیدا ہوتی ہے۔ عرفان کی آخری منزل میں پہنچ کر قیاس و استدلال کام نہیں دیتا۔ وہاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ذہن میں ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور وہ ان کی آن میں حقیقت کا مشاہدہ کرا دیتی ہے، ایسا ہی مشاہدہ جیسا کہ ہم اپنی آنکھوں سے کسی مرئی چیز کا کرتے ہیں۔ اسی مشاہدہ پر جزم و یقین کی بنا قائم ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا اعتقاد گمان اور اندازے اور اٹکل جیسی کمزور اور متزلزل بنیادوں پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ دل کی آنکھوں سے شاہدہ ایک

ایسی دیکھی بھالی بات پر ایمان لاتا ہے جس کی صداقت میں شک اور شبہ اور جانب مخالف کے امکان کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اِسی کا نام معرفت کامل ہے اور جب تک معرفت کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، انسان نہ تو پورا پورا خداشناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کے لئے اس کی بندگی خالص ہو سکتی ہے لیکن حدس کی یہ روشنی جس پر معرفت کی تکمیل موقوف ہے، انسان کے اپنے بس کی نہیں۔ نہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہے، نہ اُس کو پیدا کرنے پر قادر ہے، اور نہ کسب و کوشش سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ محض خداداد ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں "نُورِ خداداد" اور "برہانِ رب" اور "ھدایتِ الٰہی" اور "تعلیمِ خداوندی" سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَالَہٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴: ۵) "جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لیے پھر کوئی روشنی نہیں"۔ اور حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ (۱۲: ۳) "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا تو وہ بھی بھٹک جاتا" اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶: ۲۰) "لوگوں سے کہدو کہ مجھ کو میرے رب نے راہ راست کی طرف ہدایت بخشی ہے" اور حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا (۲۸: ۲) "اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا"۔

اب ان پانچوں شرطوں پر غور کیجئے۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی شرط کی ضرورت سے انکار ہے تو وجہ انکار ارشاد ہو۔ اگر کسی شرط کے بغیر انسان صداقت اور حقیقت تک پہنچ سکتا ہو تو دلیل پیش فرمائی جائے، اور اگر حقیقت رسی کے لئے ان پانچوں شرطوں کا حاصل ہونا آپ کی رائے میں بھی لازم ہے، تو بتائیے کہ کتنے لاکھ نہیں کتنے کروڑ، بلکہ کتنے ارب انسانوں میں سے ایک میں یہ شرطیں اس کمال کے ساتھ پوری ہوتی ہیں کہ وہ خداوند جل وعلیٰ جیسی، سرحد ادراک سے وراء الوراء ہستی کی معرفت کامل حاصل کر سکے؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنس بہت کمیاب ہے، تو پھر فرمائیے کہ ان کروروں بندگان خدا کا کیا حشر ہو جو اس سے محروم ہیں، یا اگر بہرہ مند بھی ہیں تو اس درجہ میں نہیں؟ کیا ہر شخص کو اس کے ناقص ذرائع کے ساتھ چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود اپنی اندھی آنکھوں

اور مفلوج پاؤں کے ساتھ خود ہی راستہ ٹٹول کر چلے، جس چیز کو چاہے "نیک نیتی" کے ساتھ خدا سمجھے، اور جس طرح چاہے اس کی پوجا کرے؟ اگر آپ کا یہی خیال ہے تو آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اپنے مرض کا علاج آپ کرنا چاہیے۔ کسی طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اپنا راستہ آپ تلاش کرنا چاہیے۔ کسی سے راستہ پوچھنے اور کسی کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو علم خود ہی حاصل کرنا چاہیے۔ کسی استاد اور معلم کی حاجت نہیں۔ کیا اس دنیا کا نظام یونہی چل رہا ہے؟

انسان کے محدود ذہن میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ تمام جہان کی قابلیتیں بیک وقت اس میں جمع ہو جائیں حتیٰ کہ وہ اپنے ہر کام میں دوسروں کی مدد سے بے نیاز رہے۔ دوسری طرف انسان کی ضروریات اتنی وسیع اور گوناگوں ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص قسم کی قابلیت درکار ہے، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنے لئے مناسب حال قابلیتیں چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف لوگوں کو مختلف قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کو طب سے لگاؤ ہے اور وہ لوگوں کی طبی ضروریات کو پورا کرتا ہے کسی کو قانون سے لگاؤ ہے، کسی کو تجارت سے، کسی کو کاشتکاری سے، کسی کو صنعت وحرفت سے، کسی کو حکومت وسیاست سے۔ یہ سب اپنے اپنے شعبے میں نوع انسانی کے محتاج الیہ ہیں، اور ہر شعبۂ زندگی کے مخصوص معاملات میں دوسرے تمام شعبوں کے لوگ اسی خاص شعبے کے آدمیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو شخص اس نظام کو توڑ کر آپ ہی اپنا طبیب، اپنا وکیل، اپنا مزارع، اپنا بیوپاری اور اپنا صناع بننے کی کوشش کرے گا، "وہ خواہ کتنی ہی "نیک نیتی" سے اس حماقت کا مرتکب ہو، فطرت کے نظام کو توڑنے کا نتیجہ بہرحال ظاہر ہوگا اور وہ یقیناً ناکام زندگی بسر کرے گا۔

یہ نظام جس طرح زندگی کے تمام معاملات میں درست ہے اسی طرح، مذہب کے معاملہ میں بھی درست ہے۔ یہاں بھی ہر شخص اس خاص قابلیت سے بہرہ مند نہیں ہے جو معبود کو پہچاننے اور اس کی صحیح طریقے سے عبادت کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ قابلیت بھی خاص خاص لوگوں کو عطا کی گئی ہے۔ انہوں نے معبود کو پہچانا ہے اور اس کی

نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں، اس کی عبادت و بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کیا ہے، اور اس کو بھی بتا گئے ہیں۔ عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ اس شعبے میں اسی شعبے کے ماہروں پر اعتماد کرے جیسی تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو قلب و روح میں جگہ دے، اور جو طریق عبادت و بندگی انہوں نے اپنے قول اور عمل سے پیش کیا ہے۔ اسی کا اتباع کرے۔ وہ بلاشبہ اس معاملہ میں بھی اپنی عقل کو استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں عقل کے استعمال کی صحیح صورت یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ناقص قوتوں اور اپنے محدود ذرائع پر اعتماد کر کے راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور جو راستہ اپنے نزدیک صحیح معلوم ہو اس پر چلنے لگے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح رہنما تلاش کرے اور جو لوگ مذہب کے میدان میں رہنمائی کے مدعی ہیں ان سب کی سیرت اور ان کی تعلیم پر اپنی حد تک ایک تحقیقی نظر ڈال کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون زیادہ بہتر اور صحیح راہ دکھانیوالا ہے کس کی ذات میں وہ پانچوں شرطیں بدرجۂ اتم پوری ہو گئی ہیں جو ہدایت یافتہ ہونے کے لئے ضروری ہیں؟ اور کس کی تعلیم سب سے زیادہ معقول اور کس کا طریقہ سب سے زیادہ قابل عمل ہے؟ اس امتحان پر جو شخص پورا اترے اس کی تعلیم کو مان لینا چاہئے اور اس کے اتباع کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر جو شخص غیر معقول طریقہ اختیار کرے گا، وہ خواہ کتنا ہی نیک نیت ہو وہ اپنی غلطی کے بُرے نتائج ضرور دیکھے گا۔ غلطی خواہ نیک نیتی سے کی جائے یا بدنیتی سے، اس کی ذمہ داری اور اس کے وبال سے انسان بچ نہیں سکتا، جو شخص بیمار ہو اور فن طب کے ماہر کو تلاش کرنے اور اس پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے ناقص علم پر اعتماد کر کے خود اپنا علاج کرنے لگے وہ اپنی اس غلطی کا نتیجہ ضرور بھگتے گا، خواہ یہ غلطی اس نے کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو۔ جو شخص قانون کے معاملہ میں ماہر قانون کو چھوڑ کر خود اپنی ناقص رائے پر عمل کریگا وہ اپنی حماقت کے نتائج سے نہ بچ سکے گا، چاہے اس نے یہ حرکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ کی ہو غلطی بہر حال غلطی ہے، اور ہر غلطی کے جو فطری نتائج مقرر ہیں وہ ہر حال میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ البتہ بدنیتی سے ایک جرم کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب میں ان آیات کی طرف توجہ کرتا ہوں جو آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش فرمائی ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس قاعدہ کلیہ کو سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ میں قرآن مجید سے استشہاد کرنے کے لئے ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر نکال لینا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے پورے قرآن پر نظر ڈالنی ضرور ہے، تاکہ مسئلہ کے تمام اطراف سامنے آجائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں ہے جس میں ترتیب کے ساتھ ہر ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو، بلکہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے جتنے مہمات مسائل ہیں وہ سب کسی ایک جگہ اپنی پوری پوری تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں کر دئے گئے ہیں، بلکہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف آیات میں موقع و محل کے لحاظ سے ان کے اطراف بیان کئے گئے ہیں۔ پس اگر آپ رسالت کے مسئلہ میں قرآن کی تعلیم ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پورے قرآن پر مجموعی نظر ڈالیے۔ ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر سلسلہ سے الگ کر لینگے تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس قاعدہ کے مطابق جب آپ قرآن کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کا مدعا محض یہ نہیں ہے کہ ہر شخص آپ اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے آزاد ہے اور ہر راستہ جس کو وہ نیک نیتی کے ساتھ درست سمجھتا ہے وہی حقیقت میں بھی صحیح ہے قرآن تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت بنی آدم کو زمین پر اتارا تھا اسی وقت اس نے ان کو سیدھا راستہ بتلانے کا کام خود اپنے ذمے لیا تھا اور ان سے صاف کہدیا تھا کہ تمہارے لئے نجات کی صورت بس یہی ہے کہ میری بھیجی ہوئی ہدایت کا اتباع کرو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (۲: ۴) پھر اس نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ یہ ہدایت ہر شخص کے پاس فرداً فرداً نہیں بھیجی جائے گی، بلکہ میں خود تم ہی میں سے کچھ لوگوں کو انتخاب کر کے ان پر اپنی ہدایت نازل کرونگا اور ان کو تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجونگا۔ جو شخص میرے رسول کو اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو سچے

دل سے مانیگا وہی ہدایت پائیگا: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷: ۴) اور جو رسولوں کو نہ مانیگا وہ اس کی سزا پائیگا۔ اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸: ۱) اور جب قیامت کے روز اس کو عذاب دیا جائیگا تو اس سے کہا جائیگا کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے اور انہوں نے تم کو خدا کی آیات نہیں سنائی تھیں اور اس دن کے انجام سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا (۳۹: ۸)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ جو شخص اللہ کے رسولوں کو نہ مانے اس کے لئے اللہ کو ماننا ہرگز نافع نہیں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا (۴: ۲۱)

تحقیق جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔

قرآن کے نزدیک مومن وہی ہے جو اللہ کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لائے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۲۴: ۹)

مومن درحقیقت وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

لہ واضح رہے کہ رسول کی تکذیب یہی ہے کہ اس کے دعوئ رسالت کو ماننے سے انکار کیا جائے۔ یہ انکار خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے بہرحال انکار ہی ہے، البتہ بدنیتی کی صورت میں انکار کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے جو شخص غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے وہ گمراہ ہے اور جو صحیح راستہ کو صحیح جانتے ہوئے غلط راستہ پر چلے وہ گمراہی کے ساتھ مغضوب بھی ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔

اور جو شخص رسول کے ذریعہ سے ہدایت کا راستہ واضح ہو جانے کے بعد بھی اس کو اختیار کرنے سے انکار کرے وہ جہنم سے بچ نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں نیک نیتی اور بد نیتی کا قطعاً کوئی سوال نہیں ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴: ۱۱۵)

اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول سے جھگڑا کرے اور مومنوں کے راستے پر نہ چلے اس کو ہم اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے اصول سے ہے، اور قرآن میں آپ کہیں ایسی کوئی بات نہیں پا سکتے جو اس کے خلاف ہو۔ آپ نے جن آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش فرمایا ہے وہ بظاہر آپ کو اس سے متناقض معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر آپ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک مسلسل پڑھیں تو تناقض کا شائبہ تک نہ رہے گا۔ چھٹے رکوع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا ..... ثُمَّ نَبْتَهِلْ

یہ علم حق تیرے رب کی طرف سے ہے لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیو۔ پھر جو کوئی اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے جب کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ کہ آؤ..... پھر ہم مباہلہ کریں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء یعنی توحید کی طرف دعوت دو اور ان سے کہو کہ ابراہیمؑ جس کے بارے میں تم جھگڑتے ہو وہ یہودی یا نصرانی نہ تھا، اور اس کے ساتھ اصلی تعلق وہی لوگ رکھتے ہیں جو اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ تم کسی کی بات نہ مانو بجز اس کے جو تمہارے دین کی پیروی کرے وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ تمام پیغمبروں سے (اور بالتبع ان کی امتوں سے) عہد لیا گیا ہے کہ ہر نبی جو خدا کی طرف سے تمہاری کتابوں کی

تصدیق کرنے کے لئے آئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اس عہد سے جو لوگ پھر جائیں وہ فاسق ہیں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر جو کچھ اترا ہے اس سب پر ایمان لاؤ یہی اسلام ہے اور جو شخص اس اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو، اس کا وہ دین ہرگز مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ آخر میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ "وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ "ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ایمان سے مراد رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ کیونکہ جو لوگ "اہل کتاب" ہیں وہ موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو یا دونوں کو اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو تو مانتے ہیں، اور خدا کے بھی قائل ہیں۔

آخری آیت جو سورۂ حدید سے آپ نے نقل فرمائی ہے، اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں، دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، پھر فرمایا گیا کہ اگر تم یہ دونوں باتیں اختیار کروگے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے، یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملے گا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً "وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (۷: ۲۱) اور "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (۵: ۱۰)۔

لیکن ایک دوسرے موقع پر یہ بھی تو فرمایا ہے۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ (۱۳: ۱۳)۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کتاب تیرے اوپر اتاری گئی ہے وہ حق ہے، اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو اندھا ہے۔

اور یہ بھی تو ارشاد ہوا ہے کہ لوگ پچھلی کتابوں کا صحیح علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے آیا ہے اور برحق ہے۔ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (۶: ۴)

لہذا ان دونوں مضمونوں کی آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جو لوگ جہالت اور نابینائی کے باعث رسول عربی کی صداقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر انبیاء سابقین پر ایمان رکھتے ہیں اور تقوی و صلاح کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو اللہ کی رحمت کا صرف اتنا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فضل فونٹن پن

سینیر ۶/۸ جونیر ۱۱/-

نیا اسٹاک آچکا ہے

خوبصورت پائدار قیمت واجبی علاوہ اس کے سامان اسٹیشنری و کاغذ وغیرہ خط و کتابت سے طلب فرمائیے

فدا علی محمد علی تاجر کاغذ پتھر گٹی حیدرآباد دکن